محمد جعفر ندوی پھلواروی

ازدواجی زندگی کیلئے اہم قانونی تجاویز

(۱)

ہمارے اس مقالے کے قدرتاً چار حصے ہوتے ہیں :-

۱- قبل از بعثت محمدی ازدواجی زندگی میں عورت کے کیا حقوق تھے۔

۲- اسلام نے اسے کیا حقوق دیئے۔

۳- اس وقت ہم مسلمان (پاکستانی) کیا حق دے رہے ہیں۔

۴- موجودہ حقوق میں کیا ترمیمات ضروری ہیں۔

ہمارا اصلی موضوع تو یہی آخری شق ہے لیکن تین اوّل شقوں کا مختصر ذکر کر دینا بھی ضروری ہے تاکہ ہمارے موجودہ معاشرے میں حقوق کی جو کمی یا فرائض کی جو زیادتی نظر آتی ہے اس کے متعلق یہ اندازہ ہو سکے کہ ہم جاہلیت سے زیادہ قریب ہیں یا اسلام سے۔

بعثت نبوی سے پہلے عورتوں کو جو حقوق دنیا کے مختلف معاشروں میں حاصل تھے ان کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے :-

عرب میں :- ۱- عورت کا مال اس کے شوہر کا سمجھا جاتا تھا، لہذا

۲- وراثت میں اس کا کوئی حصہ نہ تھا۔

۳- بیوہ یا مطلقہ اپنی پسند سے دوسرا نکاح نہیں کر سکتی تھی۔

۴- شوہر کے مرنے کے بعد دوسرے اموال کی طرح عورتیں بھی ورثا کو ترکے میں تقسیم ہوتی تھیں۔

۵- کبھی افلاس کی وجہ سے اور کبھی فرضی ننگ و عار کی وجہ سے اسے بچپنے میں ورنہ جوانی میں زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔

۶- بعض ماکولات مردوں کے لئے حلال اور عورتوں کے لئے حرام تھے۔

۷- مرد جتنی چاہے بیویاں رکھ سکتا تھا۔

۸- صریح الفاظِ طلاق کے علاوہ کنائی الفاظ اور ظہار و ایلاء کا شمار بھی طلاق ہی میں ہوتا تھا۔

۹- نان و نفقہ کا کوئی قانون موجود نہ تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ایران میں :- - مانی نے تجرد کی زندگی پر زور دیا جس کے معنی نسل انسانی کا خاتمہ تھا یا عورت کے حقوق کی نگرانی سے کامل

دستبرداری۔

۲۔ پھر مزدک نے تمام عورتوں کو آگ، پانی اور چارے کی طرح تمام مردوں کی مشترک ملکیت قرار دیا۔

۳۔ کسی رشتے دار حتیٰ کہ دختر و ہمشیر تک سے نکاح جائز اور بعض موقعوں پر ثواب تھا۔

ہندوستان میں۔ ۱۔ عورت کی ہستی مستقل بالذات نہ ہو سکتی تھی۔ نہ طفلی میں، نہ جوانی میں (شادی کے بعد) اور نہ بڑھاپے میں۔

۲۔ مورث کے ترکے میں عورت کا کوئی حصّہ نہ تھا۔

۳۔ بیوہ کوئی دوسری شادی نہیں کر سکتی تھی نہ ستگار کر سکتی تھی۔

۴۔ بعض بیواؤں کو شوہروں کے ساتھ ستی کر دیا جاتا تھا۔

۵۔ وہ طلاق لے کر یا کسی دوسری طرح پر ظالم شوہر سے ساری عمر چھٹکارا نہ حاصل کر سکتی تھی۔

۶۔ باپ جس کو شوہر ہونے کیلئے پسند کرے اسے رد کرنے کا عورت کو کوئی اختیار نہ تھا۔

یہ مختصر سا خاکہ ہے جس سے ان حقوق کا اندازہ ہو سکتا ہے جو بعثت نبویؐ سے پہلے دنیا کی عورتوں کو حاصل تھے۔

اسلام نے آکر ان عورتوں کو جو حقوق دیئے ان کا خلاصہ یوں ہے:۔

۱۔ عورت کو اختیار ہے کہ اپنی پسند سے اپنا شوہر منتخب کرے اور ولی کی پسند کو رد کرے۔

۲۔ اگر کسی مرد کو عورت ناپسند کرے تو کوئی ولی حتیٰ کہ باپ، دادا اور سلطان بھی اسے مجبور نہیں کر سکتا۔

۳۔ شوہر بعد نکاح یا قبل از نکاح ایک معین رقم یا مالیت (مہر) ادا کرے۔

۴۔ شوہر کی تمام ضروریاتِ زندگی کا ذمے دار ہوگا۔ جس میں کھانا، پینا، لباس، سنگھار، اوڑھنا، بچھونا، مسکنی، دیگر اثاث البیت، دوا، علاج، وغیرہ سب داخل ہیں۔

۵۔ اسے کھانا پکانے اور کپڑے دھونے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

۶۔ اولاد کے تمام اخراجات کا بھی شوہر ہی ذمے دار ہے۔

۷۔ اگر ماں دودھ نہ پلانا چاہے تو اسے مجبور نہیں کیا جائے گا۔

۸۔ اگر وہ دودھ پلانے کا معاوضہ طلب کرے تو شوہر کو ادا کرنا ہوگا۔

۹۔ اگر وہ اپنے شوہر سے کسی ناپسندیدگی کی بنا پر الگ ہونا چاہے تو جب چاہے کسی معاوضے پر طلاق حاصل کر سکتی ہے (جسے خلع کہتے ہیں)

۱۰۔ اس کی ہستی مستقل بالذات ہے اور اس کا مال اس کا اپنا مال ہے۔

۱۱۔ وہ اپنے جائز کسب سے کما سکتی ہے اور یہ کمائی اسی کی ہوگی۔

۱۲ - اپنے شوہر، والدین، اولاد، بھائی بہن وغیرہ کے مال سے ترکہ لینا اس کا حق ہے ۔

۱۳ - بیوہ یا مطلقہ اپنی عدّت گزار کر جہاں چاہے اپنی پسند سے عقدِ ثانی کر سکتی ہے ۔

۱۴ - دورانِ عدّت کے تمام اخراجات شوہر کے مال سے پورے کئے جائیں گے ۔

۱۵ - اگر حاملہ ہو تو ولادت تک کے تمام اخراجات بھی شوہر کے ذمّے ہوں گے ۔

۱۶ - بوقتِ نکاح عورت کی طرف سے مناسب شرائط رکھی جاسکتی ہیں جن کا پورا کرنا مرد کے لئے ضروری ہے ۔

ان قانونی حقوق کے علاوہ بے شمار اخلاقی احکام بھی ہیں اور وہی ان تمام قانونی حقوق کی اصل و بنیاد ہیں ۔ چند مثالیں اس کی بھی سنئیے :-

(۱) ولھن مثل الذی علیھن ۔ عورتوں کے حقوق تم مردوں پر وہی ہیں جو تمہارے ان کے اوپر ہیں ۔

(۲) ھن لباس لکم و انتم لباس لھن ۔ وہ تمہارا اور تم اُن کا لباس ہو ۔

(۳) زن و شو دونوں کے لئے ایک ہی لفظ یعنی " زوج " ہے ۔ شوہر بھی زوج اور بیوی بھی زوج ۔ بیوی کے لئے " زوجہ " کا لفظ غیر فصیح ہے اور قرآن نے اسے استعمال نہیں کیا ہے ۔ (لباس اور زوج دونوں کا ہماری زبان میں ایک ہی ترجمہ ہے " جوڑا ") ۔

یہ تینوں شواہد یہ ثابت کرتے ہیں کہ زن و مرد کا درجہ بھی برابر ہے اور حقوق بھی یکساں ہیں ۔ البتہ فطری صلاحیت کار اور طبعی دلچسپی کے باعث دونوں کے دائرۂ عمل جداگانہ ہیں ۔

(۴) وعاشروھن بالمعروف ۔ اپنی بیوی کے ساتھ اچھی طرح رہو ۔

(۵) فاستوصوا بالنساء خیرا (حدیث) میری اس وصیت کو قبول کرو اور عورتوں کے ساتھ بہتر (دانشمندانہ و رحیمانہ) سلوک کرو ۔ واتقوا اللہ فی النساء (حدیث) عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو ۔

ان سب باتوں کی جزئیات و تفصیلات بہت ہیں جن کو ہم نے نظر انداز کر دیا ہے ۔ اسے حرفِ مطلب کا مختصر خاکہ سمجھیئے ۔

اب مختصراً تیسری شق بھی ملاحظہ فرمایئے ۔ ہمارے موجودہ معاشرے میں عوام ہی نہیں بلکہ بعض خواص کا رویّہ بھی اس بارے میں اسلامی تعلیمات سے جداگانہ ہے ۔ اس کے دو حصّے کئے جا سکتے ہیں ۔ ایک تو خود ہمارے فقہی قوانین ۔ دوسرے ہمارا عملی برتاؤ ۔

جہاں تک اچھے اصول و قوانین کا تعلق ہے ہمارے ہاں ان کی کمی نہیں ۔ اگر اتنے ہی پر عمل ہوتا تو ہمیں کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہ تھی ۔ لیکن ہمارا جو علم اندازہ ہے وہ یہ ہے کہ :-

(۱) لڑکیوں سے کوئی باقاعدہ اذن نہیں لیا جاتا۔ بعض اوقات ان کو وہ رشتہ پسند نہیں ہوتا جو ان کے لئے منتخب کیا گیا ہے لیکن انھیں زبان ہلانے کی اجازت نہیں۔ یا تو اولیا کی ہیبت کی وجہ سے یا اس لئے کہ غلط تربیتِ معاشرہ نے ان کی یہ جرأت سلب کر کے اسے شرم وحیا کا نام دے دیا ہے۔

(۲) خود زوجین کو ایک دوسرے کو دیکھ کر انتخاب کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی حالانکہ اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔

(۳) مناکحت میں اتنے تکلفات رکھ دیئے گئے ہیں کہ یہ ایک پرابلم (PROBLEM) بلکہ مصیبت بن گئی ہے۔

(۴) دین مہر یا تو اتنا کم رکھا جاتا ہے کہ بالکل مذاق ہوتا ہے یا اتنا زیادہ جو ساری عمر ادا نہ ہو سکے۔

(۵) جہیز کی رسم کو ـــــ جو دراصل ہندوؤں سے لی گئی ہے اور اسلام میں اس کی کوئی اصلیت نہیں ـــــ ایک ضروری جزء مناکحت تصور کر لیا گیا ہے۔

(۶) عورتوں کو مارا پیٹا بھی جاتا ہے۔

(۷) بات بات پر ایک ہی نہیں بلکہ تین تین طلاقیں دے دی جاتی ہیں۔

(۸) نفقہ وغیرہ ادا کرنے میں بے توجہی برتی جاتی ہے اور اگر عورت اس کا مطالبہ یا دعویٰ کرے تو اسے خلاف تقویٰ وحیا سمجھا جاتا ہے۔

(۹) طلاق دینے میں اگر مطالبۂ مہر کا خوف ہو تو اسے معلق رکھا جاتا ہے بلکہ بعض اوقات اس کے ولی سے مطالبہ ہوتا ہے کہ اتنی رقم ادا کرو تو طلاق دی جائے گی۔

(۱۰) بچپن میں بھی شادی کر دی جاتی ہے اور بعد بلوغ اس کے اختیار فسخ پر ایسی فقہی پابندی لگا دی گئی ہے کہ وہ بے اختیار ہو کر رہ گئی ہے۔

(۱۱) "طلاق سہ گانہ بیک مجلس" کو ایسا فقہی رنگ دے دیا گیا ہے کہ زوجین لاکھ سر پٹکیں لیکن رجوع ممکن نہیں۔

(۱۲) قضائے شرعی عدالتوں سے ندارد ہے۔ جو عدالتیں ہیں اور پاکستان بننے کی وجہ سے گویا وہ اسلامی عدالتیں ہو گئی ہیں ان کا صرف نام بدل گیا ہے ورنہ ان کا ہر انداز تقریباً ویسا ہی ہے جیسا انگریزی دور میں تھا۔ ایک بے کس عورت اگر کسی ظالم سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہے یا اپنا کوئی حق وصول کرنا چاہے تو عدالت سے اس کا فیصلہ اس وقت ہوتا ہے جب اس کی آدھی عمر ختم ہو چکی ہوتی ہے یا آدمی جان نکل چکی ہوتی ہے۔

(۱۳) مرد محض اپنی ہوسناکیوں کی تسکین کے لئے یا صرف اپنی بیوی سے انتقام لینے کے لئے بے تکلف دو تین چار نکاح فرما لیتے ہیں اور اسے "سنت" بھی قرار دیتے ہیں۔

(۱۴) شوہر اگر مفقود الخبر ہو جائے یا عرصۂ دراز کے لئے جیل چلا جائے تو اس کے بیوی بچوں کی کفالت کے لئے نہ

معاشرے کے پاس کوئی انتظام ہے نہ قانونِ فقہ میں ان کی بے کسی کا علاج ہے۔

(۱۵) بہت سے مسلمان خاندانوں میں لڑکیوں کو ـــ خواہ وہ بال بچوں والی یا بیوہ ہی کیوں نہ ہو ـــ ترکہ نہیں دیا جاتا۔

(۱۶) بعض مسلم خاندانوں میں بیواؤں کے عقدِ ثانی کو انتہائی ذلت اور عیب تصوّر کیا جاتا ہے۔

(۱۷) بعض جگہ لڑکوں کی تجارت ہوتی ہے اور بعض جگہ لڑکیوں کی۔ یعنی کہیں تو لڑکے کی طرف سے طرح طرح کے مطالبات کرکے لڑکی والوں کو قرض کے بوجھ کے نیچے دبا دیا جاتا ہے اور کہیں لڑکیوں کو کافی رقم لے کر کسی شوہر کے حوالے کر دیا جاتا ہے خواہ وہ رشتہ لڑکی کے مناسب حال ہو یا نہ ہو۔

غرض اس طرح کی بے شمار خرابیاں اور ناانصافیاں ہمارے معاشرے اور قانون میں موجود ہیں اور زمانہ ان کی اصلاح کا مطالبہ کر رہا ہے۔ سوشل زندگی کا بنیادی پتھر عائلی اور گھریلو زندگی ہے۔ اگر اسی میں نقائص و مفاسد ہوں تو پوری قوم کا معاشرہ کب سنور سکتا ہے؟

ہم اس کے لئے کچھ اصلاحی تجاویز پیش کرتے ہیں تاکہ قوم کے نمائندہ حضرات ان کو ایکٹ کی شکل دے کر مجلس قانون ساز میں پیش کریں اور اس سے پہلے قوم کے اہلِ علم و فہم اس پر ضروری بحث و تمحیص فرمالیں۔ و باللہ التوفیق۔

قانونِ محض کی ناکامی

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ نرے قانون سے کبھی اصلاح نہیں ہوا کرتی۔ طبائع اگر صلاحیت و نیکی سے خالی ہوں تو قانون شکنی کے لئے الفاظِ قانون کے اندر رہتے ہوئے بھی ہزار چور دروازے نکال لئے جاتے ہیں۔ اگر زید سالانہ زکوٰۃ (از روئے فقہ رائج) سے بچنا چاہے تو بڑی آسانی سے یوں بچ سکتا ہے کہ سال گذرنے سے چند دن پہلے وہ اپنا مال خالد کے نام ہبہ کر دے اور جب خالد کا سال گزرنے لگے تو وہ مالِ موہوب کو زید کے پاس منتقل کر دے۔ اس طرح وہ دونوں ساری عمر زکوٰۃ سے بچے رہیں گے۔ اگر اس طرح کے نقل و انتقال پر کوئی دوسری قانونی پابندی عائد کی جائے تو پھر اس کے اندر بھی ایسا قانونی حیلہ تلاش کر لیا جا سکتا ہے جو پھر زکوٰۃ کی ادائیگی سے بچا لے۔ پس قانونی گرفت میں اضافے پر اضافہ کرتے چلے جانا قانون کی کامیابی نہیں بلکہ ناکامی ہے۔ قانون کی اصل کامیابی یہ ہے کہ اوّلاً وہ فروع در فروع میں پھیلنے کی بجائے اصول در اصول میں سمٹتا چلا جائے۔ دوسری کامیابی قانون کی یہ ہے کہ وہ اپنے سیاسی دباؤ کو اخلاقی تقاضوں میں تبدیل کرے اور تیسری کامیابی بہت سے قوانین کی یہ ہے کہ وہ مردہ اور غیر ضروری ہو جائے یعنی اس کی ضرورت نہ رہے۔

اسے یوں سمجھیے کہ قرآن نے ایک سیدھا سادا قانون دیا کہ "چور کا ہاتھ کاٹ دو"۔ لازمی طور پر اس کی وضاحت کے لئے کچھ ضمنی قوانین بھی بنانے پڑیں گے مثلاً چوری کی پندرہ بیس قسموں میں سے کون سی چوری کی یہ سزا ہے؟ کس طرح مال اڑا لینا چوری میں داخل یا اس سے خارج ہے؟ کتنے مال کی چوری پر یہ سزا دی جانی چاہیئے؟ کون کون سی چوری اور کن کن حالات میں قابلِ معافی ہے؟ کن صورتوں میں قطع ید کی بجائے کوئی اور تعزیر دی جا سکتی ہے؟ یہ ساری تفصیلات سزائے قطع ید کے ساتھ

ضروری سامنے آئیں گی لیکن ان تفصیلات کا یہ مطلب نہیں کہ ان موشگافیوں میں اصل مقصد فوت ہو جائے بلکہ فروع میں جانے کا اصلی مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ ان سے اصولی روشنی حاصل ہو اور روح قانون سے زیادہ سے زیادہ قرب باقی رہے۔

اس کے بعد دوسرا قدم یہ ہے کہ قانون کی لفظی موشگافیوں سے بالاتر ہو کر ایسی اخلاقی سطح حاصل کی جائے کہ قانونی شکنی سے بلا کسی دباؤ کے انسان محفوظ رہے بلکہ اگر اس سے قانون شکنی ہو جائے تو وہ خود اپنے اندرونی اخلاقی تقاضے سے مجبور ہو کر عدالت میں حاضر ہو جائے اور خوش دلی کے ساتھ اس کی پاداش کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دے۔ یہاں آکر قانونِ ملکی قانونِ اخلاق میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

پھر تیسرا قدم یہ ہے کہ معاشرے سے یہ جرم اس طرح ختم ہو جائے کہ اس قانون کی ضرورت ہی نہ باقی رہے۔ گویا قانون اپنا مقصد پورا کر کے خود مُردہ ہو جائے ——— یہ سب سے بڑی اخلاقی منزل ہے جس کا تعلق سیاسی دباؤ سے نہیں بلکہ انسانی ضمیر سے اور اسکی رُوح کی گہرائیوں سے ہے۔

پس ایسے تمام قوانین جن کے پسِ پردہ اخلاقی اقدار نہ ہوں بالکل بے روح، بے نتیجہ بلکہ بعض اوقات محرک جرائم ہوتے ہیں۔ لہذا قانونِ ازدواج و مناکحت ہو یا قانونِ طلاق، قانونِ نان و نفقہ ہو یا قانونِ جہیز و مہر، یہ سب کچھ بے اثر بلکہ بعض اوقات مضر ہوگا اگر قوم کی اخلاقی تربیت نہ ہو۔ اخلاقی تربیت کے لئے ہمیں اپنی تمام تعلیم گاہوں کا نظام بدلنا پڑے گا۔ مدرسین بھی بدلنے پڑیں گے اور درسی کتابیں بھی اور طریقۂ تعلیم بھی۔ ورنہ قانون کتنے ہی اعلیٰ ہوں اگر قوم اعلیٰ نہ ہو تو وہ قانون قوم کو ہضم نہیں ہوگا۔ گری ہوئی قوم کے لئے اعلیٰ قوانین ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے ہیضے کے مریض کے لئے نفیس کھانے۔ لہذا مجلس قانون ساز میں کوئی ایکٹ پیش کرنے والوں کو پہلی فکر اسی کی کرنی چاہیئے۔ یا کم از کم دونوں کو ساتھ ساتھ رکھنا چاہیئے۔ ورنہ جتنے قانونی شکنجے جکڑنے کے لئے بنائے جائیں گے اسی قدر قانون شکنی کے لئے قانونی نکتے بھی پیدا ہوتے جائیں گے۔ یہ پھیلاؤ صرف اخلاقی اقدار کے قیام ہی سے سمٹاؤ میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ ہم قانون سے زوجین کو چند زنجیروں میں پابند تو کر سکتے ہیں لیکن ازدواجی زندگی کی روح محض ان قانونی پابندیوں میں نہیں۔ زوجین کی مسرتوں کی اصلی بنیاد جذبہ، تعاون، رواداری، باہمی الفت و محبت اور ہمدردی وغیرہ ہے اور ان میں سے کوئی شے بھی قانونی دباؤ سے نہیں پیدا کی جا سکتی۔ قرآن ازدواج کا جو مقصد بتاتا ہے وہ سکون (لتسکنوا الیہا) ہے اور مودت و رحمت (وجعل بینکم مودۃ و رحمۃ) یہی ازدواجی زندگی کی روح ہے لیکن اس روح کو قانون سے نہیں بلکہ اخلاقی تربیت ہی سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ قانون صرف فتنہ و فساد کو دُور کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور وہ بھی اس صورت میں جبکہ اس کی زد سے بچنے کے لئے قانونی چور دروازے نہ نکالے جائیں۔ عورتیں اگر مظلوم ہوں تو ان کی مظلومی کو دُور کرنے کے لئے تنہا قانونی دباؤ زیادہ کامیاب نہیں ثابت ہو سکتا۔ فرض کیجئے آپ یہ قانون نافذ کر دیں کہ کوئی مرد ایک بیوی کے رہتے ہوئے دوسری شادی نہ کرے، تو تعلقات کی کشیدگی صرف اس قانون سے دُور نہیں ہو سکتی۔ مرد اپنی تسکین کے لئے دوسرے ناجائز وسائل ڈھونڈ لے گا جس کی کوئی روک

قانون کے بس میں نہیں۔ فرض کیجئے آپ اس کی بھی قانونی روک تھام کر لیں اور اسے آپ گھر ہی کی چہار دیواری میں رہنے پر مجبور کر دیں لیکن وہ اپنی بیوی کی طرف رُخ نہ کرے یا اس سے بات نہ کرے تو کیا آپ اس کے لئے بھی کوئی قانون بنائیں گے؟ آخر قانون آپ کا کہاں تک ساتھ دے گا؟ ہر قانون کی زد سے بچنے کے لئے ایک نیا راستہ کھلے گا اور اس نئے راستے کے سدِ باب کے لئے آپ کو پھر ایک نیا قانون بنانا پڑے گا۔ نتیجہ یہ کہ قانون کے انبار میں تو اضافہ ہوتا جائے گا اور اصلی مقصد ـــــ جو خوشگوار زندگی ہے ـــــ پھر بھی پورا نہ ہو سکے گا۔ بیوی قانوناً تو رفیقۂ زندگی رہے گی لیکن معنیً ایک "معلّقہ" کی حیثیت سے زندگی گزارے گی۔ اس کا علاج آپ بتائیں گے مفارقت۔ لیکن بیوی اسے گوارا نہ کرے تو؟ علاوہ ازیں مفارقت تو ظالم مرد کے لئے عقدِ ثانی کا اور دروازہ کھولتا ہے جس سے مرد کی زندگی سنورے یا نہ سنورے لیکن پہلی بیوی کی زندگی تو برباد ہی ہو گی۔ جتنی کوششیں اس خلا کو پُر کرنے کے لئے قانون سے کی جانی ضروری سمجھی جاتی ہے اس سے بہت زیادہ اخلاقی قدریں پیدا کرنے کی ضرورت ہے جن سے یہ خلا از خود صرف پُر ہی نہیں ہو گا بلکہ جو کچھ آپ چاہتے ہیں اس سے بھی زیادہ کچھ ہو سکے گا۔

بیوی اپنے شوہر سے صرف خوراک و پوشاک اور دوسری ضروریاتِ زندگی ہی نہیں چاہتی، وہ کچھ اور بھی چاہتی ہے۔ وہ ایک قدر دان دل چاہتی ہے، محبت بھری نگاہیں چاہتی ہے، دردمند رفیق چاہتی ہے اور اپنے ذوق اور روح کی تسکین چاہتی ہے۔ یہی خواہشیں اس کا سرمایۂ حیات ہوتی ہیں۔ یہ نعمتیں ہوں تو وہ فقر و فاقہ کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیتی۔ لیکن فرمائیے یہ نعمتیں قانون اسے دلوا سکتا ہے یا اخلاقی تربیت؟

غرض قانون انسانی زندگی میں صرف اُس کسر کو پُورا کرتا ہے جو تکمیلِ اخلاق نہ ہونے کی وجہ سے رہ جاتی ہے۔ دس بیس فی صد کسر تو قانون سے پوری ہو سکتی ہے لیکن اگر اخلاقی زندگی میں اسّی نوے فی صد کسر ہو تو قانون کی بے بسی کا تماشا دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ قانون اور اخلاق میں یہ فرق ہے کہ قانون دس بیس فیصد بھی بمشکل کسی اخلاقی خلا کو پُر کر سکتا ہے لیکن اخلاقی اقدار قانون کے مطالبے کو ایک سو دس فیصد سے بھی زیادہ پورا کر دیتی ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ قانون دراصل مجرمانہ رجحان رکھنے والی طبائع کے لئے ہوتا ہے اور اخلاقی اقدار شریفوں کی شرافت کو اور بلند کرنے کے لئے۔

پس ہم قانونی دباؤ سے جتنا زیادہ کام لینا چاہتے ہیں اس سے بہت زیادہ ہمیں اس کی سعی کرنی چاہیئے کہ تعلیم و تربیت کے علاوہ اور بھی تمام ممکن ذرائع سے اخلاقی قدروں کو روح کی گہرائیوں میں پیوست کرائیں۔ اس کے لئے بڑی جد و جہد کرنی پڑے گی۔ اس کے لئے جہاں مجالسِ قانون ساز میں بل پیش کئے جائیں وہاں اس کے ساتھ بلکہ اس سے پہلے:-

۱۔ بے روزگاری دُور کر کے معاشی خوش حالی پیدا کرنی ہو گی کیونکہ معاشی بدحالی فقط زوجین کے تعلقات ہی کو ناخوشگوار نہیں کرتی بلکہ نوّے فیصد سے زیادہ جرائم اسی سبب سے وقوع میں آتے ہیں۔ معاشی خوش حالی کا یہ

مطلب نہیں کہ غریبوں کو روپے تقسیم کئے جایا کریں بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ انھیں ہنر سکھا کر خودکفیل بنایا جائے۔

۲ - تعلیم کو اتنا عام اور ارزاں کیا جائے کہ کوئی زن و مرد اس سے مستثنیٰ نہ رہے۔

۳ - تعلیم میں جہاں دوسرے فنون پڑھائے جائیں وہاں تعلیم الاخلاق کو سب سے زیادہ ضروری قرار دیا جائے اور اسے محض فنی حیثیت نہ دی جائے بلکہ اسے اس طرح کی پریکٹیکل چیز تصور کیا جائے کہ اس میں پاس اور فیل ہونے کا مدار عمل پر رکھا جائے۔

۴ - تعلیم گاہوں میں معلّمین بھی اونچے اخلاق کے مہیا کئے جائیں۔

۵ - اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارے سیاسی، مذہبی اور روحانی قائدین اپنے ایثار، سادگی، ہمدردی، خلوص، خدمت محنت اور دیانت، غرض تمام اخلاقیات کا نہایت اعلیٰ کردار پیش کریں۔

بلاشبہ یہ سارے کام بڑے کٹھن اور صبر آزما ہیں لیکن اخلاقی زندگی کا اونچا معیار اتنی سستی جنس نہیں جو سعیِ پیہم اور طویل و صبر آزما کوششوں کے بغیر خودبخود حاصل ہو جائے۔ لیکن یہ ایسا محکم اور پائیدار راستہ ہے کہ قانون جو کچھ دباؤ ڈال کر کرانا چاہتا ہے اس سے بہت زیادہ یہاں خودبخود ہو جاتا ہے۔

یہ اخلاقی اقدار محض اسمبلی ہال کے راستوں سے نہیں پیدا کی جاسکتیں۔ ایک اونچے کردار کا مردِ قلندر اور اعلیٰ اخلاق کا بوریہ نشین درویش اپنی نگاہوں سے بعض اوقات وہ تبدیلیاں پیدا کر دیتا ہے کہ مجلس قانون ساز کی صدیوں کی بحثیں بھی نہیں کر سکتیں۔ یہ اثر کوئی منتر یا جادو سے نہیں ہوتا بلکہ کوئی اچھا نمونہ عمل اور عمدہ اسوۂ زندگی پیش کرنے سے ہوتا ہے۔ یہ قلندرانِ خدامست گفتار کے غازی نہیں ہوتے کردار کے غازی ہوتے ہیں۔ پس اصلاحِ امت کے لئے ــــ کہ اسی کا ایک جز خوشگوار ازدواجی زندگی بھی ہے ــــ سب سے زیادہ مؤثر عامل خود قائدین کرام کا نمونہ عمل ہے۔

تصویر کا دوسرا رُخ

ان تمام حقائق کے باوجود اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ قانون کو بھی زندگی میں ایک بڑا مقام حاصل ہے اور اخلاق کو بلند کرنے میں یہ بھی ممد ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے اس سے بالکل پہلوتہی اور کنارہ کشی اختیار کر کے صرف اخلاق و روحانیت پر بھروسہ کر کے کھلی چھٹی نہیں دی جاسکتی۔ جن طبائع کی اخلاقی سطح ہنوز بلند نہ ہوئی ہو یا محض اخلاقی وعظ ان کے لئے مؤثر نہ ہوں ان کے لئے قانونی دباؤ کے سوا دوسرا علاج نہیں۔ اس دباؤ کا یہ مقصد ہرگز نہ ہونا چاہیئے کہ بس ہمیشہ ان کو دباؤ ہی کے اندر رکھا جائے بلکہ غرض صرف یہ ہونی چاہیئے کہ ایک طرف ان کی اخلاقی سطح بلند ہوتی جائے اور دوسری جانب اس کے نتیجے میں قانونی گرفت ڈھیلی ہوتی جائے یہاں تک کہ قانونی دباؤ اخلاقی زندگی کا لاینفک جز بن جائے اور اس کے بعد صرف اخلاقی ہی اقدار میں زیادہ سے زیادہ ارتقا پیدا ہوتا چلا جائے۔

ابھی عام طبائع کی اخلاقی سطح اتنی بلند نہیں ہوئی ہے کہ انھیں قانونی دباؤ سے بے نیاز کر دیا جائے۔ یہ صورتِ حال معلوم نہیں کب تک رہے گی۔ لیکن جب تک ہے اس وقت تک کے کچھ قوانین کی بہرحال ضرورت ہے۔ ہم اس وقت اسی ضرورت کے پیشِ نظر کچھ تجاویز پیش کر رہے ہیں تاکہ مناسب بحث و تمحیص اور ضروری حک و اضافہ کے بعد اسے بطور ایکٹ کے مجلسِ قانون ساز میں پیش کیا جائے۔ لیکن اسے پڑھ کر ایک منٹ کے لئے بھی یہ خیال دل میں نہ لائیے کہ ہم کسی آن بھی اخلاقی اقدار کے قیام کو اس پر مقدم نہیں سمجھتے۔

ہماری تجاویز کے ضروری حصے یہ ہیں :-

(۱) ضروری باتیں قبل از نکاح یا بوقت نکاح۔

(۲) بعد از نکاح ضروری باتیں۔

(۳) طلاق کے مختلف مدارج۔

(۴) تعدد ازدواج۔

(۵) عدالتی نظام۔

قبل از نکاح یا بوقتِ نکاح

بہت سے عوامل ایسے ہیں جن کا فیصلہ یا علم قبل از نکاح نہ ہونے سے بعد میں طرح طرح کے فتنے پیدا ہوتے ہیں۔ قانون میں ان کے لئے سہولت یا پابندی ہونی چاہیئے۔ مثلاً :-

زوجین کا ایک دوسرے کو دیکھنا زوجین کو اس کا موقع دینا چاہیئے کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھنے کے بعد باہم مل کر رہنے کا فیصلہ کر سکیں۔ ضرورت ہو تو وہ باہم گفتگو کر کے بھی اپنی تسکین اور ایک دوسرے کے مزاج، حسنِ معاشرت اور کردار کا اندازہ کر لیں۔

ہمارے موجودہ معاشرے میں تعلیم اور پردے کا کچھ ایسا انداز ہے کہ قبل از نکاح زن و مرد ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ فوٹو دیکھ لیتے ہیں۔ لیکن تصویر اصل شخصیت کی پوری نمائندگی بالکل نہیں کرتی۔ شکل و صورت کا بھی صحیح اندازہ نہیں ہوتا چہ جائیکہ مزاج و سیرت اور صحت وغیرہ کا پتہ چل سکے۔ بعض جگہ عورتیں لڑکی کو اور مرد لڑکے کو جا کر دیکھ آتے ہیں۔ ان کی حیثیت ایک مشیر کی تو ہو سکتی ہے لیکن اصل انتخاب وہی ہے جو زوجین خود کریں۔ اپنے انتخاب کے بعد انھیں اپنے اپنے کنبے والوں پر غلط انتخاب کی ذمہ داری عائد کرنے کا بھی موقع نہیں رہے گا۔

احادیث میں اس کی اجازت موجود ہے مثلاً :-

(۱) ابوداؤد میں حضرت جابرؓ سے یہ روایت ہے :-

اذا خطب احدکم المرأۃ فان استطاع ان ینظر منھا ما یدعوہ الی نکاحھا فلیفعل فخطبت امرأۃ فکنت اتخبأ لھا حتی رایت منھا ما یدعوا الی نکاحھا فتزوجت۔

حضورؐ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص عورت کو پیام نکاح دے اور یہ ممکن ہو کہ وہ اس کی کوئی ایسی چیز (جمال یا سیرت یا اور کوئی خاص ادا) دیکھ لے جو اس کے لئے ازدواجی کشش رکھتی ہو تو اسے دیکھ ہی لینا چاہیئے۔ چنانچہ میں (جابرؓ) نے ایک عورت کو پیغام نکاح دیا اور چھپ کر اس کی وہ چیز دیکھ لی جو میرے لئے کشش نکاح کا سبب تھی۔ پھر اس سے شادی کر لی۔

(ب) حضرت ابوہریرہ سے مسلم اور نسائی میں ایک اور روایت یوں ہے:۔

خطب رجل امرأۃ من الانصار فقال لہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ھل نظرت الیھا؟ قال لا۔ قال فاذھب فانظر الیھا فان فی اعین الانصار شیئاً۔

ایک شخص نے ایک انصاری عورت کو پیام نکاح دیا۔ حضورؐ نے دریافت فرمایا کہ کیا تم نے اسے دیکھ لیا ہے؟ عرض کیا: نہیں۔ فرمایا: جا کر اسے دیکھ لو کیونکہ بعض انصار کی آنکھ میں کچھ نقص بھی ہوتا ہے۔

ان روایتوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ شبہات کو پہلے ہی دُور کر لینا بعد کے جھگڑوں سے بہتر ہے اور ظاہر ہے کہ جس طرح مردوں کے لئے یہ ہدایت ہے اسی طرح عورتوں کو بھی اس کا حق پہنچتا ہے۔

کم سنی یا کم شعوری کی شادی اوپر کی تشریح کے بعد اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی نکل آتا ہے کہ کمسنی کی شادی کی رسم ختم کر دینی چاہیئے۔ کمسن کو انتخاب کا کوئی صحیح شعور نہیں ہوتا اور اس کے متعلق یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ شعور آنے تک اس کی تعلیم، صلاحیت، سیرت اور صحت وغیرہ کا کیا رنگ ہوگا اور اُس وقت زوجین ایک دوسرے کو پسند کریں گے یا نہیں۔ اس پر مزید طرفہ یہ ہے کہ بعد از بلوغ عورت کو خیار فسخ اس انداز سے دیا گیا ہے جو سلب اختیار کے برابر ہے (اس ذکر آگے آئے گا)۔

ایک بڑا ظلم جو اس سلسلے میں بارہا دیکھنے میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ بے لایہ یا حریص باپ کوئی رقم لے کر اپنی کمسن دختر کو گویا بیچ ڈالتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ بعد از بلوغ لڑکی کو اس کی مرضی کے بغیر نہیں بیاہا جا سکتا لہٰذا وہ قبل از بلوغ ہی ولایت مجبرہ سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر اپنی لختِ جگر کو رقم لے کر کسی کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس وقت اُسے اپنے اختیارات بعد از

بلوغ کا نہ کوئی علم ہوتا ہے نہ اسے بتایا جاتا ہے۔ اب چونکہ شوہر رقم دے چکا ہوتا ہے اس لئے وہ اس مظلومہ کو اپنی زر خرید لونڈی سمجھتا ہے۔ وہ اپنے ظالم شوہر کو پسند کرے یا نہ کرے مگر اسے ساتھ رہنا اور ہر ستم سہنا پڑتا ہے۔ اگر اس کی پیہم فریاد پر باپ کو ترس آتا بھی ہے تو وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتا کہ اپنے داماد سے مطالبہ طلاق کرے۔ لیکن اس موقعے پر داماد اپنے خسر ہی کا حربہ اُلٹ کر اس پر استعمال کرتا ہے یعنی اتنی رقم دو تو میں طلاق دوں۔ یہ مطالبہ وہ اس لئے کرتا ہے کہ باپ نے اس سے قبل از نکاح یہی مطالبہ کیا تھا اور باپ نے یہ مطالبہ اس لئے کیا تھا کہ اس نے لڑکی کی مرضی سے نہیں بلکہ اپنی مرضی سے اسے بیاہا تھا۔ لڑکی کی رضا تو جب ہوتی کہ وہ سن شعور کو پہنچ چکی ہوتی اور اس کے اذن اور ذاتی انتخاب سے بیاہا جاتا۔ مہر پر تو ہم آگے چل کر بحث کریں گے لیکن یہاں صرف اتنا سن لیجئے کہ یہ بتیس ۳۲ روپے کو "مہر شرعی" کا لقب دینے کی رسم اسی لئے ایجاد ہوئی ہے کہ بس یہ چھوٹی سی رقم تو لڑکی کا حق ہے اور باقی جتنی رقم میں لڑکی کا سودا ہو جائے وہ ظالم باپ یا اس کے کسی اور ولی کی ہوگی۔

اس میں شک نہیں کہ مہر میں سے غریب باپ اپنی ضروریات کے لئے کچھ لے سکتا ہے اور کیوں نہ لے جبکہ وہ اسی کی بیٹی ہے جس کی پرورش پر وہ بہت کچھ خرچ کر چکا ہے۔ سیدنا شعیبؑ نے اپنی دختر کا مہر یہ رکھا تھا کہ سیدنا موسیٰؑ ان کی آٹھ یا دس سال خدمت کریں۔ لیکن بے مائگی یا ضعیفی سے مجبور ہو کر لڑکی کے حق میں سے کچھ خرچ کر لینا دوسری چیز ہے اور لڑکی کی تجارت کر کے اس سے اپنی رقم بنانا جدا شے ہے۔ یہ دونوں بالکل دو مختلف چیزیں ہیں ——— لہٰذا اس قسم کی تجارت کو بڑی سختی سے روکنا چاہیئے اور اس کا پہلا قدم کمسنی کی شادی پر معقول پابندی عائد کرنا ہے۔

یہاں یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیئے کہ محض بلوغ آتے ہی فوراً کسی میں ایسا شعور نہیں پیدا ہو جاتا کہ وہ اپنے مستقبل کے نشیب و فراز کو سمجھ لے اور اسی دن اس میں صحیح انتخاب زوج کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ اس لئے کمسنی کے نکاح کو روکنے کا یہ مطلب نہیں کہ بالغ ہوتے ہی اس کا نکاح کر دینے کی آزادی حاصل ہو گئی۔ اس کے لئے ایک ایسی اوسط درجے کی عمر کی تعیین کرنی چاہیئے جس میں شعور (باصطلاح قرآن رشد) پیدا ہو جانے کا یقین ہو۔ اس آیت پر غور کیجئے:۔

وابتلوا الیتٰمیٰ حتی اذا بلغوا النکاح ۚ فان انستم منھم رشدا
فادفعوا الیھم اموالھم ۚ

اور تم ان یتیموں (جن کے تم ولی ہو) کا امتحان کرتے رہو تا آنکہ وہ سن بلوغ کو پہنچ جائیں۔ پھر اگر ان میں "رشد" پاؤ تو ان کا مال ان کے حوالے کر دو۔

یہاں دیکھئے "بلوغ نکاح" تو بلوغت عمر کے ساتھ ہی ہو جاتا ہے لیکن یتیم کا مال محض اس بلوغ سن کے ہوتے ہی اس کے حوالے نہیں کیا جاتا بلکہ حکم یہ ہے جب ان میں اتنا شعور آ جائے کہ وہ مال کو سنبھال سکیں پھر حوالے کرو۔

بلکہ اس سے ایک آیت پہلے یہ حکم ہے کہ:۔

ولا تؤتوا السفہاء اموالکم التی جعل اللہ لکم قیاما ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ

اپنا مال جسے اللہ نے تمہارے قیام کا ذریعہ بنایا ہے کم عقل (یتیموں) کے حوالے نہ کرو۔

ان دونوں آیتوں پر غور کیجئے ۔ مال ان یتیموں کا ہے ، وہ بالغ بھی ہو چکے ہیں لیکن ان کے حوالے اس وقت تک نہیں کیا جائے گا جب تک ان کے اندر نیک و بد کو سمجھنے کا شعور و تمیز نہ پیدا ہو جائے ۔ بات بالکل صاف ہے ایسا ممکن ہی نہیں کہ ابھی ایک شخص کم عقل ہے اور ابھی بالغ ہوتے ہی فوراً صاحب عقل و تمیز ہو جائے ۔ ایک گھنٹہ پہلے کم عقل اور ایک ساعت بعد میں فی الفور عقلمند کوئی نہیں ہوتا ۔ "رشد" والی عقل و تمیز آنے میں کچھ دیر لگتی ہے اور کسی کا مال اس کے حوالے کرنے میں اسی وقت کا انتظار کیا جائے گا ۔

اب دیکھئے کہ حوالگی مال کے لئے "انتظار رشد" کی ضرورت ہے تو انتخاب زوج کے لئے ——— جو حوالگی مال سے کہیں زیادہ نزاکت کا حامل ہے کیونکہ اس میں پوری زندگی کے لئے ایک فیصلہ کرنا ہوتا ہے ——— صرف بلوغ عمر کیونکر کافی ہو سکتا ہے ؟ لازماً اس کے لئے ایک ایسا معیار عمر متعین کرنا پڑے گا جو عمومی طور پر حیات مستقبل کے نیک و بد کو سمجھنے اور انتخاب زوج کرنے کے لئے کافی ہو ۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کمسنی کی شادی روکنے کا مطلب صرف نابالغوں کی شادی کو روکنا نہیں بلکہ کم شعوروں کی شادی کا سد باب ہے ۔ زوجین میں اتنا شعور ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے مستقبل کے نشیب و فراز کو اور زندگی کے نیک و بد کو سمجھ کر انتخاب زوج کریں ۔

ہاں خاص خاص حالات ایسے بھی ہو سکتے ہیں جہاں سن رشد سے پہلے بھی ازدواج کی اجازت دی جائے ۔ اگر عدالت (ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یا تحصیلدار یا جو بھی اس کا ذمے وار ٹھہرایا جائے) کے سامنے معقول وجوہ بیان کر دی جائیں اور اسے یقین آ جائے کہ اس رشتے میں کوئی (EXPLOITATION) نہیں اور زوجین شعور تک پہنچنے کے بعد بھی اس فیصلے پر قائم رہیں گے اور حسن معاشرت سے کام لیں گے تو ہماری رائے یہ ہے کہ اس کی اجازت دے دینی چاہیئے ۔ مگر بہر حال عام قانون یہی ہونا چاہیئے کہ کم سنی یعنی کم شعوری کی شادیاں روک دی جائیں ۔

ایک شبہے کا جواب ہماری اس رائے پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے (جیسا کہ "شاردھا ایکٹ" پر کیا گیا تھا) کہ اسلام نے جب صغر سنی کے نکاح کی اجازت دی ہے تو ہم اس سے روکنے والے کون ؟ نیز حضور اکرمؐ نے خود صغر سنی میں حضرت عائشہؓ سے نکاح فرمایا تھا تو ہم اسے غیر قانونی دینے کا کیا حق رکھتے ہیں ؟

پہلے شبہے کا جواب یہ ہے کہ اسلام میں صغر سنی کی شادی کی نہ کوئی ممانعت ہے نہ حکم ۔ قرآن اس بارے میں خاموش ہے لہذا یہ فعل مرتبہ جواز و اباحت میں آتا ہے اور مباح کا ہر حال میں مباح رہنا ضروری نہیں ۔ حالات کے تقاضے سے مباح حرام بھی ہو سکتا ہے اور واجب بھی ۔ مباح تو مباح ہے اگر حالات کا تقاضا ہو تو حرام حلال اور حلال حرام بھی ہو جاتا ہے ۔ "الضرورۃ تبیح المحظورات" کا مطلب صرف یہ نہیں کہ بوقت ضرورت ناجائز شئے مباح ہو جاتی ہے بلکہ

مباح چیز کا ناجائز ہو جانا بھی اسی فقہی اصول میں داخل ہے۔ صغر سنی کی شادی کو ہم اس لئے بند کرنا چاہتے ہیں کہ اس میں شر کا پہلو غالب ہو گیا ہے۔ جب یہ صورتِ حال نہ رہے گی تو حکم پھر اپنے مقامِ اباحت پر لوٹ آئے گا۔ آپ اس بات کی دلیلیں تو پیش کر سکتے ہیں کہ ابھی صغر سنی کی شادی میں شر غالب نہیں ہوا ہے لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ جو چیز کسی دور میں مباح رہی ہو اسے قیامت تک مباح ہی رہنا ضروری ہے۔

دوسرے شبہے کا جواب یہ ہے کہ یہ روایت ہی محلِ نظر ہے کہ حضرت عائشہؓ کا نکاح چھ سال کی عمر میں ہوا تھا۔ ہمارے پاس اس کے شواہد بھی موجود ہیں کہ حضرت عائشہؓ کی بوقتِ نکاح صحیح عمر سولہ سال تھی۔ بہرحال اگر یہ چھ سال والی روایت صحیح بھی ہو تو اس نکاح میں نعوذ باللہ کون سا شر ثابت کیا جا سکتا ہے؟ یہ عین ممکن ہے کہ صغر سنی کا نکاح کسی دور اور کسی خاص تمدن میں مضر نہ ہو۔ اس صورت میں ہم نے بھی استثنا کا پہلو باقی رکھا ہے۔ اباحت و عدم اباحت کا فیصلہ ایک سوسائٹی اور ایک دور کے حالات سے ہوتا ہے نہ کہ محض ایک نظیر سے۔ کسی چیز کو جو عہدِ رسالت سے ثابت ہو، بعینہٖ قبول کر لینا اتباعِ سنت نہیں۔ اصلی اتباعِ سنت مصالح و حکم کو پیشِ نظر رکھ کر کوئی حکم لگانا ہے۔ (اس کی تفصیلی بحث "الدین یسر" میں دیکھئے جو ہمارے ادارے سے شائع ہو چکی ہے)۔

تعیینِ مہر عموماً کئی جھگڑے اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ نسبت طے کرتے وقت مہر کی تعیین نہیں ہوتی۔ بعض اوقات عین نکاح کے وقت فساد ہوتے ہوئے ہم نے بھی دیکھا ہے۔ صوبۂ پنجاب میں یہ عموماً طے کر لیا گیا ہے کہ مہر ہوتا ہی ہے ۳۲ روپے، اور اس کا نام رکھا گیا ہے "مہرِ شرعی"۔ میمنوں میں یہ طے ہے خواہ کروڑپتی کا نکاح ہو رہا ہو مگر مہر رکھا جائے گا دس روپے۔ صوبۂ بہار میں خواہ ناقہ مست کا نکاح ہو لیکن مہر رکھا جائے گا چالیس ہزار روپیہ سکہ رائج الوقت اور دو دینار سرخ۔ وہ کمی اور یہ زیادتی دونوں ہی مضحکہ خیز ہیں کیونکہ عورت کے حق میں دونوں کا نتیجہ صفر ہے۔ یہ تمام تعینات بالکل بے اصل ہیں۔ دینِ مہر کی کوئی مقدار معین نہیں حضرت ام المومنین ام سلمہ کا مہر دس درہم تھا اور ام المومنین ام حبیبہ کا چار سو دینار۔ حضرت فاطمہ کا چار سو اسی درہم۔ دراصل مہر ایک ایسی رقم ہے جسے عورت کے وقار اور مرد کی قوتِ ادا کا اوسط ہونا چاہیئے اور عین بوقتِ نکاح جھگڑا کرنے کی بجائے اسے پہلے باقاعدہ طے کر لینا چاہیئے۔ مہر کے متعلق چند باتیں پیشِ نظر رکھنی چاہئیں:-

(۱) مہر ایک واجب الادا قرض ہے اور یہ صرف منکوحہ کا حق ہے، والدین یا دوسرے اولیا کا اس میں کوئی حق نہیں۔ اولیا صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ اسے جائز طریق پر اسی کی ضروریات پر صرف کرائیں یا اسے اس کے متعلق نیک مشورہ دیں۔ آنحضرتؐ نے حضرت فاطمہؓ کی رقمِ مہر حضرت علیؓ سے قبل از نکاح ہی لے لی تھی اور اسی رقم میں سے کپڑے، خوشبو اور دیگر اثاث البیت مہیا فرمائے تھے۔ یہ بھی اس لئے کہ حضورؐ دونوں کے ولی اور منتظم تھے اور ایک الگ گھر بسانا تھا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت ابو العاصؓ کے الگ گھر پہلے سے موجود تھے اس لئے رقیہؓ و ام کلثومؓ اور زینبؓ کے مہر میں

اتنا تصرّف بھی نہ فرمایا۔ یہ مہر صرف منکوحہ کا واجب الادا حق ہے اور اس کے متعلق یہ وعید ہے کہ:۔

من تزوج امرأة بصداق ونوی ان لا یؤدیہ فھو زانٍ (مسند احمد)

جو شخص کسی عورت سے کسی مہر کے عوض شادی کرے اور ارادہ یہ ہو کہ وہ اسے ادا نہ کرے گا تو اس کا شمار زانیوں میں ہے۔

اسی مضمون کی ایک حدیث دوسرے الفاظ سے طبرانی نے بھی .... اوسط اور صغیر میں روایت کی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایسا شخص بروز حشر اللہ کے سامنے بحیثیت زانی کے پیش ہوگا۔

لہٰذا مہر اتنا زیادہ رکھنا جس کے متعلق سب کو یقین ہو کہ ادا نہ ہو سکے گا، سخت غلطی ہے۔ اور اتنا کم رکھنا، جو ایک دن کے خرچے کے برابر ہو، ایک مذاق ہے۔ مہر اتنا کم تو ضرور ہونا چاہیئے جو بہ آسانی جلد سے جلد ادا ہو سکے لیکن زوجین کے وقار و حیثیت (STATUS) سے گرا ہوا نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ کیا مذاق ہے کہ لڑکی والے دس ہزار کا جہیز دیں، پھر لڑکے کی طرف سے پارٹیوں اور دعوتوں میں ہزاروں روپے اُڑا دیئے جائیں اور مہر صرف بتیس[32] روپے رکھے جائیں؟

اس لئے ہماری رائے ہے کہ مہر اتنا رکھنا چاہیئے جو شوہر کی چھ ماہ یا ایک سال (یا عقلی مناسب مدّت سمجھی جائے) کی آمدنی کے برابر ہو۔ زیادہ رکھنے سے ناچاقی کی شکل میں بیوی اکثر معلّقہ رہتی ہے اور کم کی صورت میں تعدد ازدواج کا اور طلاق کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

(۲) مہر کی چند قسمیں ہیں:۔

(۱) معجل جو قبل از نکاح یا بعد از نکاح فی الفور ادا کر دی جائے۔

(۲) مؤجل مسمّٰی جو ایک معینہ مدّت تک ادا کیا جائے۔

(۳) مؤجل مطلق جس کا کوئی وقت معین نہ ہو یعنی وہ اس وقت ادا کیا جائے جب شوہر کی استطاعت ہو یا بیوی مطالبہ کرے۔

(۴) یا ان تینوں یا کسی دو کو جمع کر دیا جائے یعنی اتنی رقم فی الفور اور باقی اتنی مدّت تک۔

ہماری رائے میں صرف پہلی شکل کے سوا باقی سب شکلیں اڑا دینی چاہیئیں اور تیسری شکل کو قطعاً روک دینا چاہیئے۔ کیونکہ ہر ایک سے بعد میں نزاع کا امکان موجود ہے۔ خاص خاص حالات میں جبکہ اس حلقے کے ذمے دار افسر کو یقین ہو کہ کوئی خاص شر نہیں پیدا ہوگا تو دوسری اور چوتھی شکل کی اجازت دے دینی چاہیئے۔ مہر میں روپیہ ہی دینا ضروری نہیں بلکہ مالیت کی کوئی چیز بھی ادا کی جاسکتی ہے خواہ زمین ہو یا باغ یا مکان یا کوئی اور شے۔

(۳) عورت اگر خود کفیل یا فراخ دل ہو تو اپنی خوشی سے کم سے کم جتنا چاہے مہر رکھ سکتی ہے بلکہ کسی مالیت کی بجائے

کسی اور شئے کو بھی مہر قرار دے سکتی ہے۔ مثلاً شوہر ہمیں فلاں علم یا ہنر سکھا دے، یا اپنے فلاں عیب کی اصلاح کرے وغیرہ۔ حضرت ام سلیمؓ نے اپنا مہر صرف یہ رکھا تھا کہ ان کے شوہر (ابوطلحہؓ) اسلام قبول کر لیں (نسائی عن انس)

بعض شرائط ضروریہ قبل از نکاح ایسی شرائط طے کر لینی چاہئیں جن سے آئندہ مفاسد کا سدِ باب ہونے کی قوی اُمید ہو۔ یہ شرائط کہیں آنے جانے، تقسیم کار، نان و نفقہ، تفویض طلاق اور دیگر گھریلو اور خاندانی معاملات وغیرہ ہر ایک چیز کے متعلق لکھی جا سکتی ہیں۔ ان شرائط سے جانبین بہت سی باتوں کے پابند رہیں گے اور ایک پر دوسرے کا کچھ دباؤ سا رہے گا۔ یہ شرائط دونوں طرف سے لکھوائی جا سکتی ہیں جن کی پابندی زوجین کریں گے البتہ ان شرائط کو بڑی احتیاط سے لکھوانا چاہیئے تاکہ ایک مفسدے کو بند کرنے سے دوسرے ویسے ہی مفاسد کا دروازہ نہ کھل جائے۔

عقبہؓ سے حضورؐ کا یہ فرمان صحیح بخاری میں موجود ہے کہ:۔

احق الشروط ان توفوا به ما استحللتم به الفروج

جن شرطوں کو پورا کرنا ضروری ہے ان میں سب سے زیادہ اہم وہ شرطیں جن کی بنا پر تم عصمت کو اپنے لئے حلال کرتے ہو۔

جس معاشرے میں جو باتیں عموماً زوجین کے لئے وجہ نزاع ہوتی ہیں یا جن کی وجہ سے ایک فریق کو مظلومیت کی زندگی بسر کرنی پڑتی ہے ان ہی باتوں کے سدِ باب کے لئے مناسب شرائط لکھوا لینی چاہئیں جن پر دونوں فریق کے اور ان کے سرپرست گواہیوں کے دستخط ہوں۔ ان تمام شرائط کی تفصیل کو یکجا کرنا مشکل ہے اس لئے کہ ہر معاشرے میں بنائے کشمکش الگ الگ قسم کی ہوتی ہے تاہم اگر حکومت مناسب سمجھے تو ایک جامع شرائط نامہ طبع کرا دے جس میں فریقین کو حک و اضافہ کا اختیار بھی ہو۔ یہ شرائط نامہ ایسا ہونا چاہیئے جس میں ہر دو فریق کی مظلومیت کا تحفظ ہو۔ یہ شرائط نامہ بڑا ضروری ہے۔ عند الضرورت ہم اس کا مسودہ بھی پیش کر سکتے ہیں۔

جہیز کی رسم جہیز کا اسلام میں کوئی وجود نہیں۔ نہ قرآن میں اس کا ذکر ہے نہ حدیث میں نہ فقہ میں۔ مسلمانوں میں یہ رسم ان قوموں سے آئی ہے جن میں بیٹی کو ترکہ نہیں دیا جاتا اور جو کچھ دینا ہوتا ہے جہیز کے نام سے دے دیتے ہیں۔ جن بدنصیبیوں کی وجہ مناکحت کا فریضہ ایک سنگل مسئلہ اور PROBLEM بن گیا ہے ان میں سب سے بڑا حصہ اسی رسم جہیز کا ہے۔ حکومت کو بڑی سختی کے ساتھ اسے ختم کرنا چاہیئے اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ لڑکے یا لڑکے والوں کی طرف سے اس کا مطالبہ ہوا ہے اور اس کو شرط نکاح قرار دیا گیا ہے تو حکومت کو اس پر سخت تعزیری ٹوٹس لینا چاہیئے۔ یہ ظاہر ہے کہ باپ اپنی بیٹی کو برہنہ اور تہی دست کر کے گھر سے رخصت نہیں کرے گا۔ اس کی فطری محبت اسے کچھ نہ کچھ دینے پر مجبور کر ہی دیتی ہے اور صرف رخصتی ہی کے وقت نہیں بلکہ ساری عمر وہ اپنی استطاعت کے مطابق اپنی خوشی سے دیتا

رہے گا لیکن اگر اس کی محبت کا پیمانہ زیادہ چھلک جائے یا رسم و رواج کے طور اسے اپنی ناک کٹنے کا خیال اسے مجبور کرے اور اپنی حیثیت سے زیادہ بیٹی کو دے تو اس پر بھی سخت نوٹس لینا چاہیئے۔ ایسے فنائے محبت یا طالب شہرت باپ عموماً قرض و رہن یا فروختِ اشیاء پر مجبور ہو کر اپنی اور دوسروں کی زندگی خراب کرتے ہیں۔ اس کا تحفظ بھی حکومت کے فرائض میں داخل ہے۔

ہماری رائے میں اس کے لئے یہ قانون ہونا چاہیئے کہ باپ یا ولی اپنی دو ماہ (یا جو مناسب مدت ہو) سے زائد آمدنی کا کوئی جہیز نہ دے۔ اور کوئی فریق اس کے خلاف کرے تو اس پر سختی سے نوٹس لیا جائے۔ ہاں شوہر اپنی خوشی سے تخفیف یا معاف کر دے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

ایک شبہے کا ازالہ ہم نے ابھی اوپر بیان کیا ہے کہ جہیز کوئی اسلامی رسم نہیں اور نہ اس کا کتاب و سنت و فقہ میں کوئی ذکر ہے۔ اس پر یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ حضورؐ نے حضرت فاطمہؓ کو جہیز دیا تھا۔ مشہور تو یہی ہے لیکن اوپر ہم اس کی حقیقت بتا چکے ہیں کہ حضورؐ نے یہ سامان مہر فاطمہؓ ہی سے پورا فرمایا تھا اور چند چیزیں وہ تھیں جو حضرت فاطمہؓ کو دوسری بیٹیوں کی طرح حضرت خدیجہؓ سے ترکے میں ملی تھیں۔ اور یہ سامان بھی حضورؐ نے صرف اس لئے کیا کہ ایک الگ گھر بسانا تھا اور حضورؐ دونوں (علیؓ و فاطمہؓ) کے ولی و منتظم تھے۔ اگر یہ شکل نہ ہوتی تو کہیں اس کا بھی ذکر آنا چاہیئے تھا کہ حضورؐ نے حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثومؓ کو یہ یہ چیزیں جہیز میں دی تھیں اور اس کا بھی کہیں ذکر ہونا چاہیئے تھا کہ حضورؐ کی ازواج مطہراتؓ یہ یہ چیزیں اپنے ساتھ جہیز میں لائی تھیں۔ لیکن کہیں کسی دوسری تقریبات میں جہیز کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ پس حضرت فاطمہؓ کی چیزوں کو جہیز سمجھنا صحیح نہیں۔ اور اگر بفرضِ محال اسے جہیز مان بھی لیا جائے تو اس کا دوسرا جز کیوں ترک کر دیا جاتا ہے؟ کیوں نہیں سنت کے مطابق زرِ مہر پہلے لے کر اسی سے سامان مہیا کیا جاتا ہے؟

یہ بھی عجیب پیروی سنت ہے کہ زرِ مہر تو رکھا جائے بتیس ۳۲ روپے اور جہیز ہو ہزاروں روپے کا۔ یہ کیسا اتباعِ سنت ہے کہ مہر ادا کرنے میں سنتِ رسول کی پیروی ہو اور جہیز دینے لینے میں سنتِ ابولہب کی اقتدا ہو؟ اور اس پر مزید طرفہ یہ ہے کہ حساب کیجئے تو مہر فاطمہؓ کے بھی بتیس ۳۲ نہیں بنتے۔ زیادہ ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ کس نے کہہ دیا ہے کہ صرف مہر فاطمہؓ ہی سنتِ رسول ہے اور دوسری نبات مکرمات یا ازواج طاہرات کے مہور سنتِ رسول سے خارج ہیں؟

غرض رسمِ جہیز کی اسلام میں کوئی اصلیت نہیں۔ اسے بالکل ختم کر دینا چاہیئے اور کرنا ہی ہے تو زرِ مہر سے پورا کرنا چاہیئے۔ ہم نے اسے ختم کرنے کے لئے محض ایک تدریجی اور مجبوری تجویز پیش کی ہے کہ وہ باپ کی اتنے دنوں کی آمدنی سے زائد نہ ہو۔

مہر یا جہیز کے لئے کوئی رقم مثلاً دو سو یا چار سو معین کرنا غلط ہے ان دونوں چیزوں کو آمدنی کے تناسب سے ہونا چاہیئے۔

مثلاً اتنے ماہ کی اوسط آمدنی کے اندر مہر ہو اور اتنے ماہ کی آمدنی کے اندر جہیز۔

نفقہ و سکنی وغیرہ دوسرا مرحلہ نفقہ و سکنی اور فرائض و خدمات یا تقسیم کار وغیرہ کا ہے۔ نفقے میں کھانا، لباس، زیبائش، اثاث البیت اور نوشت و خواند کے سامان دوا علاج وغیرہ سب کچھ داخل ہے۔ یہ سب مرد کے ذمّے ہے اور اولاد ہونے بعد اولاد کے تمام اخراجات بھی اسی کے ذمّے ہیں۔ اس معاملے میں باہمی شکر رنجی یا تو اس لئے ہوتی ہے کہ بیوی آمدنی سے زیادہ کا مطالبہ کرتی ہے یا پھر اس لئے کہ شوہر اپنی کنجوسی کی وجہ سے گنجائش سے بہت کم دیتا ہے۔ یہ دونوں صورتیں سخت فساد کا سبب بنتی رہتی ہیں۔ حکومت کا فرض ہے اس کی بھی روک تھام کرے۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ شوہر کسی کار خیر کے لئے یا اچانک ضروریات کے لئے یا تعمیر مستقبل کے لئے (مثلاً کوئی مکان بنانا ہو یا بچوں کی تعلیم و تربیت یا شادی کرنی ہو) کچھ پس انداز کرتا ہے اور بیوی اس ضرورت کو کوئی اہمیت نہیں دیتی اور اپنا مطالبہ جاری رکھتی ہے اور نتیجہ باہمی شکر رنجی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

اس پیچیدگی کا حل کسی حد تک یہ سمجھ میں آتا ہے کہ :-

(الف) شوہر کو خمس یا عشر (یا جتنا مناسب سمجھا جائے) سے زیادہ پس انداز کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔

(ب) اس کی آمدنی کا ایک معیّن حصّہ جو اوسط درجے پر کافی ہو سکے خانہ داری کے لئے بیوی کو دلوایا جائے اگر وہ خود منتظمہ بننا چاہے۔ اور خود بیوی کے جیب خرچ کے لئے ایک معین رقم دلوائی جائے۔

(ج) معیّن اخراجات اور جیب خرچ سے زیادہ مطالبہ کرنے کا حق بیوی کو نہ دیا جائے۔

یہ تمام باتیں جانبین کے تحفظ کے لئے ہیں ان چیزوں کی تفصیل میں ہم اس لئے نہیں جانا چاہتے کہ یہ سب قبل از نکاح کے شرائط نامے سے تعلق رکھتی ہیں یہ ساری باتیں تراضیٔ طرفین سے وہیں پہلے طے ہونی چاہئیں۔ اگر بعد میں اپنی خوشی سے کسی دباؤ کے بغیر زوجین ان شرائط میں کچھ ترمیم و اضافہ کرلیں تو اس کی اجازت ضرور ہونی چاہیئے۔ اگر شوہر معین حصّہ آمدنی سے زیادہ دے یا بیوی کم میں اپنا کام چلالے اور کوئی مزید مطالبہ نہ کرے تو حکومت کو اس میں کیا دخل ہے؟ یہ تو عین منشائے قانون اور منشائے اخلاق کی تکمیل ہے۔

سکنیٰ یہ معاملہ بھی کچھ کم نزاکت کا حامل نہیں۔ ازدواج کا اسلامی نقطۂ نگاہ سے مقصد ہی یہ ہے کہ ایک الگ گھر اور الگ خاندان آباد کیا جائے اور زوجین خود اپنی ذمے داریوں کو سنبھالنے کے قابل ہوں۔ ان کی زندگی کے بے ہمہ اور باہمہ۔ ایک گھر کے اندر مختلف خاندانوں کے رہنے سے طرح طرح کے فساد پیدا ہوتے ہیں اس لئے اہل خانہ کو ایک الگ "خانہ" بگھرا اور علیحدہ خانے داری کے مطالبے کا حق ہے اور شوہر کو بھی الگ رکھنے کا حق ہے۔ لیکن مکانوں کی جو دشواریاں اس وقت پاکستان میں ہیں وہ کوئی پوشیدہ راز نہیں۔ اگر شوہر بیوی کو اس کے میکے میں نہ رکھنا چاہے یا بیوی اپنی سسرال میں نہ رہنا چاہے تو موجودہ حالات میں اس کا حل تلاش کرنا بے حد مشکل ہے۔

اس لئے ہماری رائے میں یہ کوئی لازمی ہونے کے لئے کوئی قانون نہیں ہونا چاہیئے بلکہ فریقین پہلے ہی اس کا اندازہ کر کے اس کے متعلق کوئی فیصلہ شرائط نامے میں لکھوا دیں جس میں حالات بدلنے کے بعد دونوں کو ترمیم و اضافہ کا اختیار ہو۔

خادم اور تقسیم کار بعض اشخاص دس ملازم و ملازمہ بھی رکھ سکتے ہیں اور بعض ایک بھی رکھنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ لہٰذا ان باتوں کا فیصلہ بھی قبل از نکاح ہی شرائط نامے میں مناسب طرح پر دونوں کی ضرورت و استطاعت کے مطابق کر لینا چاہیئے اگر ضرورت ہو۔ یہی صورت حال تقسیم کار کی بھی ہے۔ اگر ضرورت ہو تو اس کے لئے بھی شرائط نامے میں خاصی گنجائش ہے۔ اگر باہمی اعتماد ہو تو بہت شرطیں ایسی ہیں جن کو تحریر میں لانے کی ضرورت ہی نہیں۔ اگر بعد میں ضرورت ہو تو دونوں طرف کے اولیا یا وکلا مناسب الفاظ میں شرائط نامے میں ترمیم و اضافہ کر سکتے ہیں۔ اس لئے ان باتوں کے لئے قانونی دفعات کی ضرورت نہیں۔

(باقی آئندہ)

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

نے

جو تحقیقی اور بلند پایہ کتابیں شائع کی ہیں ان کی فہرست ادارہ سے طلب فرمائیے اس میں ان کتابوں کے متعلق تعارفی نوٹ بھی درج ہیں جن سے آپ کو ان کی اہمیت و افادیت کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔

سکریٹری ادارۂ ثقافت اسلامیہ۔ ۲ کلب روڈ۔ لاہور

مضامین

ماہنامۂ ثقافت

میں

اشاعت کے لئے

نظمیں اور مضامین

مندرجہ ذیل پتہ پر ارسال فرمائے جائیں

مدیر ماہنامۂ ثقافت

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ ۲۔ کلب روڈ۔ لاہور